مجلس عمل کی پارلیمانی جدوجہد کے چار سال

لیاقت بلوچ

قرارداد مقاصد اور ۱۹۷۳ء کے دستور میں یہ بات طے کر دی گئی کہ پاکستان کے عوام اپنی قیادت اور پارلیمنٹ کا آزادانہ طریقے سے خود ہی انتخاب کریں اور اس بات کو بھی طے کر دیا گیا کہ پاکستان کے عوام کو اسلامی اصولوں کے مطابق پارلیمانی جمہوریت اور وفاقی نظام کے دائرہ کار کے اندر رہتے ہوئے ہی اپنے ضمیر کے مطابق اپنی رائے کا آزادانہ اظہار کرنا ہے۔ مگر ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو چوتھی مرتبہ ملک پر جنرل پرویز مشرف کے ذریعے فوج ایک بار پھر اقتدار پر قابض ہوگئی۔ نواز شریف کو پارلیمنٹ کے اندر دو تہائی اکثریت حاصل تھی۔ لیکن آئین سے ماورا اقدام اٹھاتے ہوئے ان کی حکومت کو ختم کیا گیا اور قومی اسمبلی، سینیٹ اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کو بیک جنبش قلم تحلیل کر دیا گیا اور ۱۹۷۳ء کے دستور کو عملاً غیر مؤثر کر کے ملک میں از سر نو مارشل لا کے ذریعے اقتدار پر غاصبانہ قبضے کو یقینی بنایا گیا۔ اس اقدام کا گرینڈ نیشنل ڈیموکریٹک الائنس (GDA)' پاکستان پیپلز پارٹی' تحریک انصاف اور ایم کیو ایم کی طرف سے خیر مقدم کیا گیا اور نواز شریف حکومت کے خاتمے کو درست اقدام قرار دیا۔ جماعت اسلامی غالباً وہ واحد دینی اور سیاسی جماعت ہے جس کی طرف سے اس فوجی اقدام کی دوٹوک مخالفت کی گئی۔ جمہوری نظام کو معطل کرنے کی مذمت کی گئی اور ملک میں فوری طور پر جمہوریت بحال کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔

ملک کے صدر جناب رفیق تارڑ نے جو آئینی سربراہ حکومت تھے جنرل پرویز مشرف کے اس اقدام کے بعد ایوان صدر کے اندر ٹھیرنا منظور کیا اور اس عرصے میں فوجی ڈکٹیٹرشپ جو اقدام کرتی رہی اس پر ایوان صدر سے نہ کوئی سرزنش کی گئی' نہ کوئی احتجاج کیا گیا اور نہ کوئی ڈائریکشن دی

گئی۔ عملاً ڈیڑھ سال تک وہ ایوان صدر میں رہے۔ ڈیڑھ سال کے بعد جنرل مشرف نے انھیں بھی توہین آمیز طریقے سے رخصت کیا اور چیف ایگزیکٹو کے عہدے کے ساتھ ساتھ صدارت کے عہدے پر بھی قابض ہوئے۔ ملک میں ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء سے جمہوری، سیاسی اور آئینی اداروں کی شکست وریخت کا جو عمل شروع ہوا تھا اس اقدام کے بعد وہ اپنے منطقی اور انتہائی انجام کو پہنچ گیا۔

اس عرصے میں مسلم لیگ (ن) کی قیادت نے سپریم کورٹ سے رجوع کیا کہ فوجی اقدام کو غلط قرار دیا جائے اور آئین کے مطابق ان کی حکومت کو بحال کرتے ہوئے ملک میں آئین کو غیر مؤثر کرنے کے اقدام کو غلط قرار دیا جائے۔ ظفر علی شاہ کیس میں سپریم کورٹ کے بنچ نے عملاً اس چیز کو رد کیا اور بعض تحفظات کے ساتھ فوجی اقدام کے اس عمل کی توثیق کردی۔ ریفرنڈم کے موقع پر امیر جماعت اسلامی پاکستان محترم قاضی حسین احمد نے ریفرنڈم کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا۔ سپریم کورٹ کے بنچ نے اس وقت بھی یہ قرار دیا کہ پی سی او کے تحت ریفرنڈم منعقد کیا جاسکتا ہے۔ عملاً ان فیصلوں کے بعد پرویز مشرف کی داخلہ وخارجہ اور نظریاتی محاذوں پر پالیسی ۱۸۰ درجے کے انحراف کے ساتھ آگے بڑھی۔

اس دوران ۱۷ جون ۲۰۰۱ء کو متحدہ مجلس عمل وجود میں آئی۔ چھے دینی جماعتوں کے سربراہ اسلام آباد میں جمع ہوئے۔ افغانستان کے حالات کے تناظر میں فوجی ڈکٹیٹرشپ اور لادینیت کے حوالے سے رہنما اصولوں پر مبنی ایک چارٹر پر اتفاق کیا گیا اور پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ متحدہ مجلس عمل کی صورت میں دینی وسیاسی جماعتوں کا انتخابی اتحاد وجود میں آیا۔ ابتدا میں یہ خیال تھا کہ یہ مختلف مسالک رکھنے والے لوگ، جلد ہی باہم ٹکرائیں گے اور یہ اتحاد تحلیل ہوجائے گا اور اپنا وجود کھودے گا۔ لیکن مجلس عمل نے اپنی تنظیم سازی، ٹکٹوں کی تقسیم، حکومت سازی، پارلیمنٹ میں کارکردگی اور بین الاقوامی مسائل پر مشترکہ لائحہ عمل اختیار کر کے ان سارے مفروضوں کو ناکام بنادیا۔ مجلس عمل کی قیادت نے حالات کا ادراک کرتے ہوئے بڑے سلیقے کے ساتھ نئے چیلنجوں کے مقابلے میں قوم کو دینی بنیادوں پر متحد کیا۔

مجلس عمل کو عملاً کئی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ سرحد کے بلدیاتی انتخابات میں مجلس عمل کو دھچکا لگا لیکن اس شر سے یہ خیر برآمد ہوا اور سب کو آگاہی ہوئی کہ اتحاد میں ہی عزت اور وقار ہے

اور یقیناً یہ اتحاد مستقبل میں بھی ملک وقوم کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ انتخابات میں صوبائی ممبران کا انحراف بھی مجلس عمل کی قیادت کے لیے مشکلات کا باعث بنا ہے لیکن اسی صوبے میں اے این پی، پی پی پی اور مسلم لیگ (ن) کے ممبران اسی دولت کی دہلیز پر ڈھیر ہوگئے۔ لیکن اخباری پروپیگنڈے کے حوالے سے 'بڑی' کسی پارٹی کو جرأت نہیں ہوئی کہ اس کی تحقیق کرے اور یہ متعین کرے کہ ان کے کتنے اور کون کون ارکان صوبائی اسمبلی آتش زر کی حدت سے پگھل کر مرکزی اقتدار کے ساتھ بہہ گئے ہیں۔ مجلس عمل کی قیادت اور پالیسی ساز ادارے نے اپنے ہی ممبران کے خلاف تادیبی کارروائی کر کے عملاً سیاست کے میدان میں نیا کلچر متعارف کروایا ہے۔

اس عرصے میں فوجی ڈکٹیٹرشپ تمام غیر جمہوری اور غیر اخلاقی اقدامات کرتی رہی۔ ایم ایم اے نے حکومتی چالوں اور عیارانہ رویے پر احتجاج کیا۔ پاکستان کی تمام سیاسی و دینی جماعتوں نے سیاسی نظام کے ایکٹ کی ترمیم اور بلدیاتی انتخابات اور منتقلی اقتدار کے تحت انتخابات کے ان مراحل کو، پھر عام انتخابات کے بعد اور اس سے پہلے ایل ایف او کے تحت انتخابات میں حصہ لینے کو ترجیح دی۔ کسی دوسری جماعت نے بھی ایل ایف او کے تحت انتخابات کے کسی مرحلے میں سیاسی پیش بندی سے اجتناب نہیں کیا۔ اس کی بنیادی روح یہی تھی اور سیاسی و دینی جماعتیں اس پر متفق تھیں کہ جب پبلک میں بظاہر مقبول جماعتوں نے فوجی ڈکٹیٹرشپ کے کسی اقدام کو چیلنج نہیں کیا، اس ڈکٹیٹرشپ سے چھٹکارے کا راستہ، انتخابات، مکالمہ اور پارلیمنٹ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ پھر ۱۰ اکتوبر ۲۰۰۲ء کو انتخابات ہوئے اور آئینی ترامیم کے ساتھ سیٹوں میں اضافہ ہوا۔ اس سے قبل قومی اسمبلی ۲۱۷ ارکان پر مشتمل تھی لیکن ترامیم کے بعد یہ تعداد ۳۴۲ کر دی گئی۔ ۲۷۲ عام نشستیں، خواتین کی ۶۰ نشستیں، اقلیتوں کے لیے ۱۰ نشستیں اور اس طرح ۳۴۲ کے ایوان کی ہیئت ترکیبی طے پائی۔ سینیٹ کی سیٹوں میں بھی اضافہ کر کے اس کی نشستوں کی تعداد ۱۰۰ کر دی گئی۔ عام نشستیں ۵۶، خواتین ۱۰، اسلام آباد ۴، فاٹا ۸ نشستیں، اس طرح سینیٹ کی کل ۱۰۰ نشستیں کر دی گئیں اور یہ تمام صوبوں کے درمیان برابری کی بنیاد پر نشستیں ہیں۔

مجلس عمل نے سرحد اور بلوچستان میں کتاب کے نشان کی بنیاد پر انتخابات میں حصہ لیا۔ پنجاب میں اسٹیبلشمنٹ اور فوجی ڈکٹیٹرشپ کا غلبہ تھا۔ یہاں کوشش کی گئی کہ اپوزیشن جماعتوں سے

ایڈجسٹمنٹ کی جائے تاکہ فوجی ڈکٹیٹرشپ کا مقابلہ کیا جاسکے۔ پاکستان پیپلز پارٹی، مسلم لیگ (ن) کے درمیان انتخابی عمل طے نہ پاسکا۔ مجلس عمل اور مسلم لیگ (ن) اور تحریک انصاف کے درمیان نیم دلی کے ساتھ تاخیر سے ایڈجسٹمنٹ ہوئی لیکن عملاً نتائج پر اس کا کوئی بہت بڑا اثر نہیں پڑا۔ ان انتخابات میں جو نتائج سامنے آئے ہیں ان کے مطابق قومی اسمبلی میں جنرل نشستوں پر ہمارے ۱۴۳ امیدوار کامیاب ہوئے۔ اسلام آباد سے ایک، فاٹا سے ۷، خواتین ۱۲ اور اقلیتوں میں ایک مرد اور ایک خاتون۔ اس طرح عملاً ہمارے ۶۵ ارکان منتخب ہوئے۔ ایک ممبر جن کا جماعت اسلامی سے تعلق تھا اوّل روز سے ہی منحرف ہوگئے اور ایک اور ممبر جن کا تعلق جمعیت علماے اسلام سے تھا وہ بھی مجلس عمل کے فیصلوں سے عملاً پہلو تہی کرنے لگے۔ اس طرح سینیٹ میں پنجاب سے ایک، سندھ سے ایک، سرحد سے ۱۰، بلوچستان سے ۶، فاٹا سے ۴ نشستیں ملیں۔ اب اس وقت سینیٹ کے اندر ہمارے ۲۶ ارکان موجود ہیں۔ بلوچستان اسمبلی میں مجلس عمل کے ممبران ۱۸ ہیں۔ پنجاب میں ۱۱ منتخب ہوئے۔ ایک رکن کا انتقال ہوگیا اور ایک صاحب راولپنڈی سے انحراف کرگئے۔ سندھ سے ہمارے ۱۰ ممبران منتخب ہوئے، ان میں سے دو انحراف کرگئے۔ ان میں سے ایک کا تعلق اسلامی تحریک اور ایک کا جمعیت علماے اسلام (ف) سے ہے۔ سرحد سے ۶۸ ارکان اسمبلی منتخب ہوئے۔

مرکزی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر کے لیے ہمارا مطالبہ تھا کہ ایک نشان پر سب سے بڑا گروپ مجلس عمل کا ہے۔ اس کا حق بنتا ہے کہ اپوزیشن لیڈر کے لیے مجلس عمل کو ترجیح دی جائے۔ بالآخر ۲۵ مئی ۲۰۰۴ء کو محترم مولانا فضل الرحمٰن کو بحیثیت اپوزیشن لیڈر تسلیم کرلیا گیا۔ اسی طرح سینیٹ میں پہلے مرحلے میں مجلس عمل کے ۲۱ ارکان موجود تھے۔ حکمران گروپ کے بعد ایک بڑے گروپ کی حیثیت سے مجلس عمل کا حق تھا کہ سینیٹ میں بھی اپوزیشن لیڈر ہمارا ہو جس کے لیے طے بھی پایا کہ محترم پروفیسر خورشید احمد سینیٹ میں اپوزیشن لیڈر ہوں گے اور محترم مولانا گل نصیب مجلس عمل کی پارلیمانی پارٹی کے لیڈر ہوں گے۔ مگر حکومت نے پیپلز پارٹی کے میاں رضا ربانی کو یک طرفہ طور پر اپوزیشن لیڈر بنانے کا اعلان کردیا۔ ہم نے اپوزیشن کے اتحاد کے لیے اس کو برداشت کیا کہ اپوزیشن جماعتوں میں اختلاف نہیں بڑھنا چاہیے حالانکہ مرکزی سپریم کونسل کے فیصلے کے مطابق سینیٹ میں ۲۲ ارکان کے ساتھ اپوزیشن لیڈر کے لیے ہمارا حق بنتا ہے۔

ان چار سالوں میں قومی اسمبلی میں ہم نے ۱۲۷۳ سوالات، بین الاقوامی موضوعات پر ۵۱۷ تحاریک التوا، عوامی مسائل پر ۱۲۳۱ توجہ دلاؤ نوٹس، ۲ ہزار ۷ سو ۳۱ قرار دادیں جو عوامی قومی اور بین الاقوامی مسائل سے متعلق تھیں، نیز ۱۲۵ تحاریک استحقاق پیش کیں۔ ایک تحریک جو ۲۴۱ کہلاتی ہے، جس پر بحث ہوئی و دیگر ۲۹۱ نوٹس۔ اس طرح رول ۶۹ جس کے تحت اہم ایشو پر آٹھ گھنٹے کی بحث ہوسکتی ہے، بجٹ کی بحث میں ۶۹ نوٹس، ۱۵۲ کٹوتی کی تحریکیں پیش کیں۔ اسی طرح سینیٹ میں ۲ ہزار ۲ سو ۵۷ سوالات، ۱۸۶ تحاریک التوا، ۳۳۵ توجہ دلاؤ نوٹس، ایک ہزار ۹ سو ۱۱ قرار دادیں اور ۱۵ تحاریکِ استحقاق جمع کرائیں۔ ہمارا ایک باقاعدہ پارلیمانی دفتر ہے جس میں ہمارے ساتھی بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ اس سارے کام کو سرانجام دیتے ہیں۔ ہمارے ممبران اور خاص طور پر خواتین ممبران نے اپنے منفرد تشخص، وقار اور عرق ریزی کے ساتھ قومی ایشوز پر نہ صرف بروقت گرفت کی بلکہ دعوتی و تنظیمی اعتبار سے بھی اپنے کردار کو مؤثر اور جان دار انداز میں پیش کیا۔

منتخب اداروں میں قانون سازی اہم ترین موضوع ہے۔ ہم نے قومی اسمبلی میں ۳۴ نئے بل جمع کرائے اور اس وقت تک ۳۶ بل زیرِ بحث آئے ہیں۔ ان میں سے ۱۰ کی پہلی خواندگی اور ترامیم کے نتیجے میں حتمی بحث میں بھرپور حصہ لیا ہے۔ اس طرح فنانس بل ۰۴-۲۰۰۳ء، ۰۵-۲۰۰۴ء اور ۰۶-۲۰۰۵ء کی بجٹ، عام بحث میں حصہ لیا اور ترامیم بھی جمع کرائیں۔ اسی طرح جتنی بھی مجالس قائمہ موجود ہیں ان میں ہماری سرگرم اور بیدار نمایندگی موجود ہے۔

۳۴ نئے بل ہم نے اسمبلی سیکرٹریٹ میں دیے۔ اس میں سنگین غداری، انڈسٹریل ریلیشنز آرڈی ننس جو این ایل ایف کے تعاون سے تیار کیا گیا، آغا خان یونی ورسٹی امتحانی بورڈ کی تنسیخ کا بل اور آرمی ایکٹ میں ترامیم شامل ہیں۔ اسی طرح قرآن کی طباعت، قومی سلامتی، دستور میں ترمیم یا جہیز یا شادی کے تحائف سے متعلق، مختلف عوامی، سماجی، سیاسی اور بین الاقوامی ایشو پر مجوزہ مسودہ ہاے قانون (bill) پیش کیے۔

آئین کے مطابق صدر کی یہ ذمہ داری ہے کہ پارلیمنٹ کے ہر پارلیمانی سال کے آغاز پر خطاب کریں۔ انھوں نے ایک سال خطاب کیا ہے، مزید پارلیمانی سال ایسے گزرے ہیں کہ وہ اس سے خطاب نہیں کرسکے ہیں۔ صدارتی ویب سائٹس پر سوال کا جواب دیتے ہوئے جنرل پرویز

مشرف نے کہا کہ یہ غیر مہذب پارلیمنٹ ہے۔ میں اس سے خطاب نہیں کرنا چاہتا۔ ان میں خوف اور بزدلی ہے۔ وہ اداروں کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں۔ جس کی بنیاد پر وہ خطاب کی جرأت نہیں کر سکے۔ اسی طرح داخلہ و خارجہ اور مالیاتی امور میں یا پالیسی سازی میں کابینہ یا پارلیمانی پارٹی کو کوئی اختیار نہیں۔ اس کے فیصلے فردِ واحد کے ہاتھ میں ہیں یا کور کمانڈرز کی سطح پر کیے جاتے ہیں۔ عملاً پارلیمنٹ کو غیر مؤثر بنا کے رکھ دیا گیا ہے۔

کراچی کے حالات، فاٹا، بلوچستان، ریلوے کے حادثات، تخریب کاری، امن عامہ کے مسائل اور زراعت کے مسائل پر تحریکیں بھی دیں اور اس پر بحث بھی کی۔ تیل کی قیمتوں میں اضافہ، بے روزگاری، جرائم میں اضافہ، ذرائع ابلاغ اور الیکٹرانک میڈیا حیاسوز اور فحش مناظر کی بہتات کے خلاف، چینی اور سیمنٹ کے بحران پر قرار دادیں پیش کیں، احتجاج بھی کیا ہے۔ مغرب میں چھپنے والے توہین آمیز خاکوں کے خلاف سب سے پہلے نومبر ۲۰۰۵ء میں قومی اسمبلی میں ہم نے تحریک پیش کی اور اس مسئلے کو اٹھایا لیکن اس کے بعد حکومت نے کوئی اقدام نہ کیا۔ پاک فضائیہ میں، پی آئی اے میں افسران اور بطور سٹیورڈ افسران کے لیے داڑھی منڈانے کے احکامات، یا ائیر ہوسٹس کے لیے ایک عمر کی حد کے بعد برطرفی اور دوپٹے کے معاملے پر بھی ایوانوں میں احتجاج بھی کیا اور مؤثر آواز اٹھائی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان چار سالوں میں قومی اسمبلی اور سینیٹ اراکین اور چاروں اسمبلی کے ممبران کی تمام کوششوں اور تیاریوں کے باوجود جو نتیجہ برآمد ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہوا اور ملک اور قوم کی توقعات پوری نہ ہوسکیں۔ سال ۲۰۰۳ء بہت اہمیت کا سال تھا۔ قومی اسمبلی کے اجلاس اور ایل ایف او پر احتجاج ہوا جو ۲۴ دسمبر ۲۰۰۵ء تک جاری رہا۔ پھر مذاکرات کا ڈول ڈالا گیا۔ مجلس عمل اور پیپلز پارٹی کے ساتھ مذاکرات ہوئے۔ مجلس عمل کو پیش کش تھی کہ وہ ڈپٹی پرائم منسٹرشپ، ڈپٹی اسپیکر شپ اور وزارتوں میں حصہ لے لیکن مجلس عمل کے ساتھ حکومتی مذاکرات اس لیے ختم ہوگئے کہ ہم نے ایل ایف او کو پارلیمنٹ میں یا آئینی ترامیم کو یا صدارت کو یا ریفرنڈم کی بنیاد پر سپریم کورٹ کی توثیق کو قبول نہ کیا۔ حکومت سازی کے لیے ہمارے مذاکرات ختم ہوئے تو پیپلز پارٹی سے حکومت میں حصہ لینے کے تمام مراحل طے پائے۔ مخدوم امین فہیم کو عملاً پرائم منسٹر کے طور پر پروٹوکول

ملنا شروع ہوگیا۔ ان کے مذاکرات ایل ایف او یا جمہوریت کی بنیاد پر نہیں بلکہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کے مقدمات کی واپسی میں ناکامی کے باعث ختم ہوئے۔ وہ چاہتے تھے کہ مخدوم امین فہیم کے حلف سے پہلے مقدمات واپس ہوں لیکن فوجی ڈکٹیٹرشپ چاہتی تھی کہ وہ پہلے حکومت کا حصہ بنیں اور اس کے بعد مقدمات واپس ہوں۔

تمام اپوزیشن جماعتوں نے آئینی امور پر مذاکرات میں حصہ لیا ہے۔ مذاکرات میں ایل ایف او کے وہ ۲۹ بنیادی نکات تھے جن کے ذریعے آئین کی ترامیم کا اقدام کیا گیا تھا۔ تمام اپوزیشن جماعتوں نے ۲۲ نکات پر اتفاق کیا۔ سات اختلافی نکات تھے۔ اے آر ڈی کی تجویز پر آٹھویں آئینی ترمیم کے طرز پر سترھویں آئینی ترمیم حکومت نے طے کی اور اسی طرح جب سترھویں آئینی ترمیم کا بل تیار ہو کے آیا تو اے آر ڈی، مجلس عمل اور حکمران جماعتوں نے دوشقوں کے علاوہ سترھویں آئینی ترمیم پر مکمل بحث اور حصہ لے کے اپنا کردار ادا کیا لیکن اس پر بعد میں تنقید ہوئی کہ یہ دراصل حکومت کا جال اور بدنیتی تھی۔ اپوزیشن جماعتیں سیکولر شناخت کے ساتھ حکومتی جال کا حصہ بنیں، جب کہ مجلس عمل اور دین کی آواز کو زک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ درحقیقت مجلس عمل نے ان بنیادوں پر اس چیز کو طے کیا کہ فردِ واحد کو اس کا حق حاصل نہیں۔ سپریم کورٹ کی طرف سے سند جواز ملنے کے بعد حکومت از خود آئین میں ترمیم کا حق نہیں رکھتی۔ دو تہائی اکثریت اس کی بنیاد ہے۔ اس طرح ریفرنڈم کوئی آئینی حیثیت نہیں رکھتا۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کو محفوظ رہنا چاہیے۔ یہ محفوظ نہیں رہتا تو پارلیمنٹ کی جگہ صدارتی نظام آنے کی صورت میں پاکستان کا وجود خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

اس وقت مجلس عمل نے جو معاہدہ کیا اس کے مطابق ۳۱ دسمبر ۲۰۰۴ء کو جنرل پرویز مشرف کو صدارت سے فوجی عہدہ الگ کرنا چاہیے تھا۔ یہ معاہدے کی اصل روح تھی۔ ایس ایم ظفر کی کتاب Dialogue on the Political Chessboard (سیاسی شطرنج کی تختی پر مکالمہ) میں اس کی مکمل تفصیل موجود ہے۔ اس آئینی ترمیم کی کوئی حیثیت نہیں۔ ایل ایف او اسی طرح اس قوم کی گردن پر مسلط ہے۔ اپوزیشن جماعتوں نے اس چیز پر اتفاق کیا ہے کہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو آئین جس شکل میں تھا اس کی بحالی کی جدوجہد کی جائے۔ سترھویں ترمیم کا مخمصہ ختم ہونا چاہیے۔ جنرل پرویز مشرف کے دور اقتدار میں اس اسمبلی کے وجود میں آنے سے پہلے ۳۱۷ قوانین اور

آرڈر جاری کیے گئے تھے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ۱۹۵۴ء میں آئین بنا پھر ۵۶ء میں بنا اور پھر ۱۹۷۳ء میں دستور بنا۔ جنرل پرویز مشرف کے دور میں دو تین فیصلے موجود ہیں۔ ٹرانسفر آف پاور کے یہ تمام مراحل موجود ہیں۔ ایک حکومت کے خاتمے کے بعد ملک میں کوئی خلا پیدا نہیں ہوتا۔ نئی یا عارضی حکومت جو اقدامات کرتی ہے، کوئی مانے یا نہ مانے اس کی اپنی ایک حقیقت اور حیثیت موجود رہتی ہے۔ پھر اب تک بننے والے تمام آئینی اور انتظامی اقدامات کو کسی تعزیر یا قانونی چارہ جوئی سے جو برأت و تحفظ (indemnity) دیا گیا، اس کو آئینی ترمیم نہیں بلکہ سادہ اکثریت کے ساتھ کسی وقت بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ جس نظام کی تبدیلی کے لیے یہ ساری جدوجہد آگے بڑھ رہی تھی، جنرل پرویز مشرف اپنی انا اور ڈکٹیٹرشپ کو قائم رکھنے کے لیے سول بیوروکریسی اور ملک کے اقتدار پر اپنی گرفت ختم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے اپوزیشن جماعتوں کے پاس تحریک اور جدوجہد کے سوا کوئی راستہ نہیں۔

پرویز مشرف کی موجودگی میں نئے انتخابات کا شفاف اور غیر جانب دارانہ ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے اس پر اتفاق کیا گیا ہے کہ جنرل پرویز مشرف مستعفی ہوں۔ سیاسی جماعتیں اپنے طرزِ عمل سے سبق سیکھیں اور کسی ڈکٹیٹر جنرل کو ریلیف دینے کے بجاے جمہوریت کو ترجیح دیں۔ سیاسی جماعتوں نے اس پر بھی اتفاق کیا ہے کہ وفاقی پارلیمانی نظام ۱۹۷۳ء کے دستور کے مطابق ہو اور صوبوں کو اپنی انتظامی حدود کے اندر مکمل ضروری اختیارات دیے جائیں۔ آئین کے مطابق موجودہ حکومت اور صدر مستعفی ہوں اور عبوری حکومت قائم ہو۔ اگلے الیکشن ایک بااختیار الیکشن کمیشن کی تشکیل کے بعد منعقد ہوں۔

ان چار سالوں میں ہم نے اپنی حد تک کوشش کی کہ باقاعدہ پارلیمانی پارٹی کے اجلاس کریں۔ تمام ایشوز پر اتفاق راے پیدا کریں اور کوئی بھی ایسا ایشو نہیں ہے جس کو پارلیمانی پارٹی میں زیر بحث نہ لایا گیا ہو۔ مجلس عمل اور اس میں جماعت اسلامی کی تنظیم نے یہ کردار ادا کیا کہ اتحاد کو بھی قائم رکھا جائے اور جو قومی، بین الاقوامی اور عوامی ایشوز ہیں، ان میں بھی اپنا کردار ادا کیا جائے۔ پاکستان کی اسلامی ثقافت، دوقومی نظریے، مسجد اور مدرسے پر جو سیکولر یلغار ہے اس کے مقابلے کے لیے ہم نے مسلسل کوشش بھی کی ہے اور ایشوز کو زندہ رکھنے کے لیے اپنا کردار بھی ادا کیا ہے۔